مسلک دیوبند چودھویں صدی کی پیداوار ہے
محمد قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی سے پہلے
کسی مسلمہ شخصیت سے ان کا تعلق نہیں

(دارالعلوم دیوبند کے شیخ کا اعتراف)

WWW.NAFSEISLAM.COM

۴۶

مسلکِ دیوبند کیا ہے؟

مولانا سید انظر شاہ صاحب
استاذ تفسیر دارالعلوم۔ دیوبند

ادارہ البلاغ کا مضمون کے ہر ہر جزء سے مکمل اتفاق ضروری نہیں

حکم ہے ایک عزیز کرم کا جو غالباً عمر میں کم اور علم و ذکاء، فہم و دانش میں بہر اعتبار آگے ہیں، کہ اکابر دیوبند پر ان کے متعلق کے لئے کچھ لکھوں، لیکن سوچتا ہوں کہ اکابر کے تعارف سے پہلے، تو دیوبندیت ہی کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ پتے اور کونپل۔ رگ و ریشے۔ شاخیں اور ان کا لمبا سلسلہ سب کچھ جڑ ہی سے براہ راست تعلق رکھتا ہے، اگر اصل ہی شخص و متعین نہیں تو برگ و بار کی تعریف و تعارف، حقیقت کی دریافت کی دانی و کافی راہ نہیں۔ مضمون زیر قلم ہے تو عمر چالیس کے سن و سال سے آگے قدم بڑھا رہی ہے۔ بات اگرچہ اس دور میں بھی وہی ہے، جو کریما کے مصنف نے غالباً مجھ ایسوں ہی کے لئے کہی تھی کہ

؎ چہل سال عمر عزیزت گزشت
مزاج تو از حال طفلی نہ گشت

تاہم جو کچھ ہوا وہ ہوا اور جو ہونا ہے وہ بھی ہو کر رہے گا۔ اتنا تو بطور تحدیث نعمت عرض کرنے کی ہمت رکھتا ہی ہوں کہ اب رد و قبول کا معیار بحمداللہ شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ ہے، یعنی جو کچھ سنا اور پہنچا اور پہنچے گا، عقل کی کسوٹی اسے خود بھی پرکھ کر دیکھنے کا جذبہ وافر رکھتی ہے، گویا کہ اگہی و شعور مقلد نہیں، بلکہ اپنے لگے بندھے کام میں مصروف ہیں، قرآن، حدیث، نبی اور پیغمبر دین و ملت، فقہ و روایت، بلکہ حد تو یہ ہے کہ اپنے اسلاف کے بارہ میں جو کچھ سنا اور سن رہا ہوں خوب ٹھونک بجا کر، اسے قبول کرنے کی عادت پڑ چکی، یہ کلیشہ گوئی بھی، اور مدح خود کی کوئی جلی و خفی شکل نہیں بلکہ آنے والے بیانات و حقائق کو قابل قبول بنانے کی ایک معقول تمہید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پڑھنے والے اور سننے والے، محض یہ کہہ کر، تحریر کو ہاتھوں سے نہ رکھ دیں کہ دیوانہ کا

؎ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے جس سے غالباً کچھ سوچنے اور سمجھنے کا جو ڈھنگ اپنانا ہے اس کی کوئی خاص شکل آپ کے سامنے آئے کہ غدر کی معروف جنگ جس میں براہ راست علماء وقت بھی شرکت کر رہے تھے۔ اپنے اکابر سے بارہا سنا کہ جس وقت حضرت حافظ ضامن الشہید و شہادت کے مقام ارفع پر فائز ہو گئے تو غالباً سید الطائفہ حضرت الحاج مولانا امداد اللہ قدس سرہٗ العزیز نے فرمایا کہ "بس اب جنگ لڑائی ختم، وہ تو خدا تعالیٰ کو حافظ جی کے شوق شہادت کی تکمیل مقصود تھی جو یہ سارا ہنگامہ کھڑا ہوا تھا، ورنہ اب لڑائی کی بھی کیا ضرورت" پھر انہیں اکابر سے مسلسل یہ بھی سنتا رہا کہ ٹھیک حافظ صاحب کی

ایک طومار اور مرویات کا پلندہ ہے۔ ایسا نہیں بلکہ فراغت کے برائے نام ہی سہی بہرحال سترہ برس کے عرصہ کے بعد جس حد تک واقعات کی دریافت ممکن ہو سکی "جدوجہد" کے اسی حاصل کو سامنے لا رہا ہوں، کہنا یہ ہے کہ جس طرح اسلام، تمام ہی مذاہب میں، مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے بعد میرے لئے ایک دین برحق ہے، جس کے ایک ایک جزو پر خدا کا شکر ہے کہ ایمان اور کی دولت سے سرفراز ہوں، اسی طرح فقہی مکاتیب میں حنفی فقہ کی جامعیت گہرائی و گیرائی پر... دل و دماغ مطمئن ہیں دوسرے مکاتیب کی صحت و درستگی کے یقین کے باوجود حنفی فقہ کی ترجیح، علم و یقین کے درجہ میں حاصل ہے، بلکہ امام اعظمؒ کے خصوصی تفقہ پر دل اسی درجہ مطمئن ہے، جیسا کہ استاذ الاساتذہ حضرت سیدنا شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے بارہ میں بتواتر سنا کہ جس قول میں امام اعظم کو منفرد پاتے، تا آنکہ ان کے مشہور تلامذہ ابو یوسف اور محمد رحمہما اللہ بھی ان کے ہمنوا نہ ہوتے، شیخ الہند علیہ الرحمۃ اس صورت حال پر بجائے، پریشان و پشیمان ہونے کے بے حد مطمئن رہتے، فرماتے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ بات اس درجہ دقیق، نازک اور عمیق تھی، جہاں تک ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کسی اور کی نظر پہونچ ہی نہیں سکتی تھی "او کما قال" بلکہ سننے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ جس مسئلہ کو حضرت مرحوم فقہاء کے مابین قطعاً اتفاقی پاتے، اس پر تشریح و تفصیل کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی یہ ارشاد فرماتے ہوئے گذر جاتے کہ

"چلو بھائی یہ بات تو اتنی سامنے کی ہے کہ سب ہی کو نظر آ گئی"

اس موقعہ پر سیدنا الامام مولانا انور شاہ کشمیری تغمدہ اللہ بغفرانہ کی وہ آخری تقریر بھی پیش نظر رہنی چاہئے، جو آپ نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے سالانہ اس اجلاس میں الوداعی فرمائی

(متعلقہ صفحہ گزشتہ) شہادت کے بعد جگہ جگہ بھڑکتے ہوئے شعلے جنگ اور لڑائی کے اس طرح بجھتے رہے جیسے کوئی پانی ان چنگاریوں کو ڈال رہا ہو؟ روایت تو سن لی مگر دل ہمیشہ اباء و انکار کرتا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ خدائے حاکم و حکیم کی تکوینیات و تقدیر، محض ایک انسان کی خواہش و تمنا کے لئے اگرچہ وہ کتنا ہی مقبول و مکرم ہو، پورے ملک کو جنگ کے شعلوں اور آگ میں جھونک دے؟ لیکن جب قرآن ہی کے مسلسل درس و تفسیر کا موقع آیا اور لڑائی ہوا تو احد کے واقعات میں یہ الفاظ آنکھوں سے دل میں اتر گئے، فرمایا۔ "ویتخذ منکم شہداء" جس کا ترجمہ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا ہے کہ "کرے بعضے تم میں شہید" آیت سے متعلق روایات میں آیا ہے کہ بعض وہ خدا کے جو بدر کے معرکہ میں شرکت نہ کر سکے تھے اور جنہیں احد کے کارزار میں شوق شہادت اور گلوئے خدا کے نام پر کٹنے والا بنے قرار خون، لیکر پہونچا تھا، احد میں ناکامی کے بے چوڑے اسباب بیان کرتے ہوئے ایک سبب یہ بھی حکیم و علیم نے بتایا کہ اس طرح بعض سعید روحوں کی تمنائے شہادت کی تکمیل بھی مقصود و مطلوب تھی ایسا نہ ہو یہ امت جس کا آخر بھی خیر سے خالی نہ ہے اور نہ انشاء اللہ کبھی ہوگا کیوں ممکن نہیں کہ تقدیر و مقتدر ان کی بعض تمناؤں کو پورا کرنے کے لئے، تقدیر جیسے ہنگامے کھڑا کر دے، شر میں خیر کا جو پہلو رکھ دیا گیا جس کو دیکھ کر کہنے والے نے کہا تھا "کہ خدا شر سے برانگیزد کہ خیر ما در آں باشد" اس پہلو کو سامنے رکھے ہوئے کسی کے لئے خیر کا دروازہ سیکڑوں کے لئے شر بنا کر بہرحال کھولا جا سکتا ہے، خوب کہنے والے نے کہا ہے ؎

کرتو چنیں خواہد خدا خواہ چنیں　　می دہد بزداں مراد منصبی

بہرحال حافظ ضامن صاحب سے متعلق روایت کو قبول کرنے میں کم از کم مجھے اب کوئی تذبذب نہیں، اولین میں اس طرح کی روایت اگر موجود ہے تو آخرین کے لئے امکان کو بھی نہ ماننا عقل و آگہی کے بے مصرف کاموں سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

جس کے بعد پھر اس ناسوتی دنیا میں آپ کا قیام مجدد دے چند ماہ ہی رہا فرمایا کہ:

"ہم نے اپنی عمر کے چالیس سال محض اس مقصد کے لئے صرف کر دیئے کہ دیکھیں فقہ حنفی حدیث کے مطابق ہے یا نہیں، سو ہم اپنی چالیس سالہ محنت کے بعد قطعاً مطمئن ہیں، جہاں جس درجہ کی حدیث خصم کے پاس ہے اسی درجہ کی حدیث احناف کے پاس بھی موجود ہے، اور جہاں حدیث نہ ہونے کی بنا پر امام ابو حنیفہ نے مسئلہ کی بنیاد قیاس پر رکھی وہاں دوسروں کے پاس بھی کوئی حدیث موجود نہیں۔"

یہ تفحص و تلاش نہ میرے لئے ممکن اور نہ بحالت موجودہ متوقع تاہم اکابر کو جو کچھ یقین کد و کاوش پر میسر آیا کچھ بھی ہو اس ظلوم و جہول کو وہ دولت، الحمد للہ بہر حال حاصل ہے۔

اسی طرح ہندوستان اور بیرون ہند میں جس قدر نظریاتی اعتبار سے مکاتیب فکر و نظر پھیلے ہوئے چلتے یا پلتے رہے ان سب میں، دیوبندیت کی اصابت، اور مکمل حدیث و قرآن یا سنت و دین سے اس کی موافقت پر، شرح صدر کی دولت مجھے میسر ہے، ہر تعصب سے بالاتر ہو کر جس قدر میں نے غور کیا یا فکر و نظر کی جتنی راہیں مجھ پر کھل سکیں، دیوبندیت کو اسی دین کی ایک مکمل تصویر میں نے پائی جو مکہ اور مدینہ زادہما اللہ شرفاً وتعظیماً سے، اپنی ابتدائی اور انتہائی، بلکہ ارتقائی شکل میں چلا تھا یہ ہے ایک مختصر جواب۔ تمہید میں اٹھائے ہوئے اس سوال کا کہ آخر دیوبند یا دیوبندیت ہے کیا چیز، ذرا تفصیل اور اس کی ہو جانی چاہئے تاکہ دیوبندیت اپنے تمام زوایا و گوشوں خصوصیات اور ممیزات کے ساتھ دوسرے تمام مکاتیب فکر میں ممتاز ہو جائے۔

میرا خیال یہ ہے کہ "ما انا علیہ واصحابی" جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اطہر سے، اسی سوال کے جواب میں تراوش ہوا تھا "نجات پھر کس فرقہ کی ہوگی؟" یہی دیوبندیت کی مختصر اور مفصل، جوجز اور مبسوط تعریف سے تعارف ہے، پس میرے نزدیک، دیوبندیت خالص ولی اللہی فکر بھی نہیں، اور نہ کسی خاص خانوادہ کی گلی بندھی فکر دولت و متاع۔ میرا یقین ہے کہ اکابر دیوبند جن کی ابتداء میرے خیال میں سیدنا الامام مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور فقیہ اکبر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے ہے، علم کامل، اور شعور بالغ کے ساتھ، قدرت نے ان کو ایک ایسی چھلنی بھی عطا کی تھی جس سے وہ افکار و نظریات کو چھان ہی قبول کر سکیں، مجھے اس حقیقت کے واشگاف کرنے میں کوئی تامل و تذبذب نہیں ہوتا کہ ہندوستان کی سیاسی و مذہبی پامالی کے دور میں، دین کو اپنی شکل میں باقی رکھنے کے لئے، دیوبند کا وجود قدرت کا ایک عظیم لطیفہ ہے۔ اور جن اکابر کو، فکر و نظر کی تراش و خراش کے لئے خدا تعالیٰ نے کھڑا کر دیا، وہ عظیم انسانی، صدیوں کی الٹ پھیر میں، وجود پذیر ہوتے ہیں، اس لئے یہ دیوبندیت کی ابتداء حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کرنے کے بجائے، مذکورہ بالا دو عظیم انسانوں سے کرتا ہوں اس میں شک نہیں کہ ہماری حدیث کا سلسلہ حضرت شاہ صاحب، ہی پر منتہی ہوتا ہے۔ اور آج ہندو پاک میں حدیث و قرآن کے جو زمزمے سنے جاتے ہیں ان میں خانوادہ ولی اللہی کا براہ راست دخل ہے۔ اس لئے

---

* چند سال گذرتے ہیں دارالعلوم دیوبند کے آفاقی کتب خانہ میں ایک باخبر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے پروفیسر، اچانک مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ دیوبندیت کیا ہے؟ اسی کے جواب میں جب میں نے اپنی مذکورہ بالا دریافت ذرا تفصیل سے بیان کی تو سننے کے بعد وہ بولے کہ "مولوی صاحب اس حقیقت پر تو اکثر دیوبندی بھی مطلع نہیں، اور کھینچ تان کر خود کو ولی اللہی فکر سے جوڑ رہے ہیں، حالانکہ دیوبندیت کے امام تو صرف یہی دو امام وقت ہیں ۱۲

ان کی خدمات جلیلہ کا انکار نہیں ہو سکتا۔ تاہم کم از کم مجھے تو شاہ صاحب اور دیوبند میں فرق نمایاں اور واضح نظر آتا ہے جس کے بعد، دیوبندیت کو ولی اللہی لٹریچر کا ایک سرچشمہ قرار دینے میں مجھے تامل ہے، بلکہ میرے اپنے مطالعہ کا حاصل تو یہ ہے کہ دیوبندی لٹریچر سے بہت کچھ حضرت شیخ الحدیث شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ قریب ہیں۔ فقہ حنفی کی برتری کا یقین اور اس کی اشاعت جو دیوبند کے متعارف اجزاء ترکیبی میں ایک عنصر غالب ہے، جس قوت کے ساتھ شاہ عبدالعزیز رح کے یہاں ہے، ان کے والد ماجد قدس سرہ العزیز کے یہاں اس کا نام و نشان بھی نہیں[۵]، اگر ہے بھی تو نہایت گول و مول انداز میں

اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جو شاہ صاحب مرحوم سے کم از کم میرا دیوبند کو دور لیجا کر کھڑا کرتا ہے۔ "والقصۃ بطولہا"[۱] اس لئے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ دیوبندیت کے واقعی امام وہی دو بزرگ ہیں، جن کا نام آپ مجھ سے سن چکے، الحاج صوفی مولوی عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ دارالعلوم کے ابتدائی بانی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ آفاقی اور عالمی درسگاہ کے تخیل سے مرحوم کا دل و دماغ قطعاً خالی تھا، ایک عظیم درسگاہ جو آفاقی تصور کی حامل ہو۔ کلیۃً حضرت مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مرہون منت ہے، نیز ابتدائی آویزشیں جو حضرت مولانا قاسم صاحب اور حاجی عابد حسین مرحوم میں رہیں، جن کی محاط

---

[۱] یہاں اپنے ایک پرانے خیال اور پھر اس میں تجربہ و آگاہی کے بعد تبدیلی کا ذکر بھی مناسب ہے، ایک عرصہ تک میرا خیال یہ رہا کہ دیوبند کو اپنا تعلق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے کیوں نہ قائم کرنا چاہیے۔ غالباً ہندوستان میں اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے حدیث کے سلسلہ میں ان کی خدمات کچھ کم وقیع نہیں، شروح حدیث میں شاہ صاحب مرحوم کے قلم سے جو کچھ جواہر پارے تیار ہوئے انہیں تو سبھی جانتے ہیں۔ ان کے صاحبزادہ شیخ نورالحق رح کی تشریح بخاری بھی ایک زمانہ میں مروج و متداول رہی، اسرۂ خانوادہ کی خدمات علماء ولی اللہی کے کنبہ کی طرح اگرچہ جلیل و وقیع نہیں تاہم حدیث و قرآن سے ہند کو واقف کرنے میں شیخ عبدالحق مرحوم کا بھی بہرحال حصہ ہے۔ مگر پھر یہ رائے بھی بدل گئی، اول تو اس وجہ سے کہ شیخ مرحوم تک ہماری سند ہی نہیں آتی، نیز حضرت شیخ عبدالحق کا فکر کلیۃً دیوبندیت سے جوڑ بھی نہیں کھاتا۔ غالباً کشمیری یہ بات بہت سوں کو چونکا دینے والی ہو مگر اس موقع پر میں ایک جلیل اور صاحب نظر عالم کی رائے میں اپنے لئے پناہ ڈھونڈتا ہوں۔ سنا ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم فرماتے تھے کہ "شامی اور شیخ عبدالحق پر بعض مسائل میں بدعت و سنت کا فرق واضح نہیں ہو سکا"۔ بس اسی اجمال میں ہزارہا تفصیلات ہیں جنہیں شیخ کی تالیفات کا مطالعہ کرنے والے خود سمجھیں گے ۱۲ منہ۔ میری ان تصریحات سے یہ سمجھنا کہ امام الہند کی عقیدت میں یہ حقیر کسی سے کم ہے۔ مجھ پر ایک ظلم ہوگا کیا عرض کروں اپنی موجودہ حالت کو اسی امام وقت کا ایک روحانی فیض و تصرف باور کرتا ہوں جس زمانہ میں یعنی ۱۹۴۷ء میں ہند و پاک کے دو ابھرے ہوئے خطوں سے پہلے دہلی میں پنجاب یونیورسٹی سے متعدد اردو فارسی امتحان دینے کے بعد براہ راست انگریزی میں پڑھ چکا تھا، اور جن حالات میں اگر موت آجاتی تو غالباً "موت جاہلیۃ" ہی ہوتی۔ ہر جمعہ کو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء اور سیدنا الامام الدہلوی کے پرانوار مزارات پر برابر حاضری ہوتی اور جو دعائیں ہوتیں ان کی تفصیل کئے بغیر موجودہ مشغلہ انہیں بزرگوں کے روحانی تصرف تسلیم کرتا ہوں دوسروں سے سننے کی کوئی جدوجہد پیش نظر بھی نہیں، اب بھی دہلی کا کوئی سفر غالباً الامامؒ کے مزار پر حاضری کے بغیر نہیں ہوتا اور بارہ سال کے دوران میں تین بار ایسا ہوا الحمدللہ معمول ہے، تاہم جو بات کہنا ہو وہ ایک نہ ایک دن کہی جائے گی پس اعتراضات و نکتہ چینی اور "لومۃ لائم" کے خطرہ سے بے نیاز ہو کر میں ہی کیوں نہ عرض کر دوں ۱۲

تعمیر شکر رنجی، یا مشاجرات ہی سے ہو سکتی ہے، میرے نزدیک اسکی واقعیت صرف اتنی نہیں کہ عمارت کے منصرہ یا وسیع کرنے پر دونوں بزرگوں کا اختلاف تھا، جیسا کہ میں اپنے بزرگوں سے برابر سنتا رہا، مجھے عرض کرنے دیجئے کہ یہ آویزش خالص "نظریاتی جنگ" تھی میں تفصیلات میں تو ہرگز نہیں جاؤں گا اس لئے کہ وہ ایک دلخراش تاریخ کا باب ہے، لیکن اپنے علم و مطالعہ کی بنیاد پر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ جو دیوبند۔ حضرت حاجی عابد حسین المغفور کی زیر تربیت بن رہا تھا، وہ یقیناً اس دیوبند سے مختلف ہوتا جس کا آج تعارف اور شہرت، عالم اسلامی سے گذر کر اقصائے عالم میں پہونچ چکی ہے[۱]۔ اس لئے تسلیم کرنا ہوگا کہ موجودہ عمارت کے بانی ہونے کے ساتھ فکر اور تخیل کے امام بلاریب حضرت مولانا قاسم صاحب علیہ الرحمۃ ہیں: جن کی پوری جدوجہد میں حضرت گنگوہی ثانی اثنین کی حیثیت سے ہر مرحلہ پر کارفرما نظر آتے ہیں۔

---

[۱] سمجھنے کے لئے صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ چھتہ کی مسجد جہاں سے دارالعلوم کی ابتدا ہوئی ہے۔ حضرت حاجی صاحب مرحوم کی نشستگاہ یہی مقدس عمارت ہے۔ اس مسجد میں رمضان المبارک کے چار (۴) جمعوں میں اب تک میلاد حضرت حاجی صاحب کی یادگار میں جاری ہے، میں نے کیا لکھا ہے اسی اجمال میں، نکتہ سنج اسی ساری تفصیلات کو پڑھ لیں جتنے میں لے کم از کم تاریخ نگاری کے تلخ فریضہ کے قطعاً خلاف، سنانے سے پہلو بچالیا۔